صائمہ نذیر
لیکچرار شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

۷۰ کی دہائی کی پاکستانی غزل: فکری جہات

Saima Nazir

Lecturer, Urdu Department, NUML, Islamabad.

70s' Pakistani Ghazal: Thematic Study

Pakistan has been facing a continuous troublesome political and social circumstances right after the partition of the sub continent. Fall of Dhaka in 1971 was a big misfortune along with other social and political disasters faced by the nation which shattered the confidence of the people. Literature of this decade narrates the story. Urdu Ghazal of this decade also reflects the emotional and psychological atmosphere of the society. This article is an attempt to study and analyze 70's Urdu ghazal in its thematic context.

۷۰ء کی دہائی پاکستان کے لیے سیاسی، معاشی اور جغرافیائی تبدیلیاں لے کر سامنے آئی۔ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہونا، سیاسی توڑ پھوڑ، مارشل لاء کا نافذ ہونا اور ایک منتخب وزیرِ اعظم کی پھانسی، یہ وہ اہم واقعات ہیں جو اس دہائی کے ادب پر اثر انداز ہوئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی، اس کے اسباب اور نتائج ایسے موضوعات ہیں جو ۱۹۷۱ء کے بعد اردو شعر و ادب میں مختلف رنگ و روپ اور انداز میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ ملک میں پے در پے مارشل لاء کے نافذ ہونے سے ادب میں مجموعی طور پر ایک مزاحمتی رویہ پروان پڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ وہ تاریخی المناک واقعہ تھا جس نے سب سے زیادہ ادب پر اثرات مرتب کیے۔

سقوط ڈھاکہ کے اثرات کے بعد جو ادب پر ماتمی فضا نے ڈیرہ جما لیا اس کا بھرپور اظہار غزل میں ملتا ہے۔ اس سانحے کی وجہ سے دردمندی، قومی کرب، وعدوں کا ٹوٹ جانا، امیدوں کا ٹوٹنا، جسم کا ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنا جیسے موضوعات غزل میں دکھائی دینے لگے۔ ان موضوعات کا اظہار جس طرح سے غزل میں ہوا کسی اور صنف میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ہجرت کی صعوبتوں کا ذکر بھی غزل کا خاص موضوع بنا۔ ہجرت کا موضوع شاعری کے لیے کوئی نیا موضوع نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستانی عوام کو ایک بڑی ہجرت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس ہجرت اور اس ہجرت میں بہت فرق ہے۔ اس ہجرت میں ایک نئے وطن میں

جانے کی امنگ اور خوشی کا عنصر شامل تھا جبکہ اس ہجرت میں اپنوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اپنے ہی بھائیوں میں اجنبی ہونے کا احساس بھی شامل تھا۔ غزل میں ان موضوعات کا کھل کر اظہار کیا گیا۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> اس موضوع (پاکستان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس کے اسباب ونتائج) کے جتنے پہلوؤں کا احاطہ غزل نے کیا اتنا ہمارے ادب میں کسی صنف نے نہیں کیا۔(۱)

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میرِ کارواں ٹھہرے

(باقی صدیقی)

وعدہ نہ دلاؤ یاد ان کا
نادم ہیں ہم اعتبار کر کے
اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

(باقی صدیقی)

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

(احمد فراز)

ہم اس شہر کی آب و ہوا میں جیسے زندہ ہیں
اور کوئی ہوتا تو جیتے جی بھی مر جانا تھا

(سلیم کوثر)

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

(پروین شاکر)

سانحہ دو نیم ہونے کا پرانا تو نہیں
اور دلوں میں بھی ابھی تاریخ کا کچھ ڈر تو ہے

(پروین شاکر)

اے ربِ جلیل کیا غضب ہے
کیوں دکھ مری سرزمین پر ہیں

(محسن احسان)

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے الگ الگ ہو جانے سے ہزاروں لوگوں کو ہجرت کی صعوبت برداشت کرنا پڑی۔

ہجرت جیسی آزمائش انسانی وجود میں بے گھری کی اذیت بے یقینی اور ضد کو جنم دیتی ہے۔ انسان خود کو بے زمین محسوس کرتا ہے یہی وہ حالات تھے جنھوں نے دھرتی سے محبت اور اس کی اہمیت کے احساس کو جگایا شعرا اور ادبا نے اس احساس کو شدت سے بیان کیا ہے۔ خصوصاً غزل میں اس کا اظہار ملتا ہے۔

رکتے تو کیسے رکتے کہ تنہا نہیں تھے ہم
راہیں تھیں منزلیں تھیں سفر بے حساب تھے

(خالد سعید)

منزلیں راستوں کی دھول ہوئیں
پوچھتے کیا ہو تم مسافت کی

(سلیم کوثر)

برف کی ناؤ میں سوار ہیں ہم
اور سورج سروں کے اوپر ہے

(کلیم عثمانی)

وہ دور آیا کہ وہ بھی گھروں کو چھوڑ گئے
جو سوچتے تھے کہ اب مستقل سکونت ہے

(فاطمہ حسن)

کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پہ بنائے عذاب رکھتا ہے

(افتخار عارف)

سمجھ رہی تھی میں اپنے قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

(فاطمہ حسن)

قیام پاکستان کے وقت مشرقی اور مغربی پاکستان یعنی دونوں حصوں میں بے شمار افراد بھارتی علاقوں سے نقل مکانی کر کے آئے اور یہاں آکر آباد ہوئے جو لوگ مغربی پاکستان میں آئے وہ تو چاروں صوبوں میں رچ بس گئے لیکن جو بدنصیب مشرقی پاکستان کو اپنا وطن سمجھ کر وہاں گئے انھیں ۱۹۷۱ء میں پھر اس دربدری کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنوں کے ہاتھوں اپنوں کی تباہی نے حساس دلوں کو خون کے آنسو رُلا دیے اپنوں سے امید اور بھروسہ ختم ہو گیا اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ غزل میں بھی اس موضوع کو بیان کیا گیا۔ بے یقینی کی فضا ہر طرف طاری تھی کس پر اعتبار کیا جائے اور کس پر اعتبار نہ کیا جائے یہی بے یقینی کی کیفیت غزل کا موضوع بھی بنی۔

آسمانوں کی طلب میں بے زمیں رہ جائیں گے

دیکھنا ہم سب کہیں کے بھی نہیں رہ جائیں گے

(صابر ظفر)

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں
اک نوح نہیں جو ہمیں کشتی میں بٹھا لے
ورنہ کسی طوفان کے آثار تو سب ہیں

(مرتضٰی برلاس)

لوگوں نے اپنے سینوں پہ پتھر جو رکھ لیے
اس دور نے دعاؤں سے تاثیر چھین لی
یہاں موسم بھی بدلیں تو نظارے ایک جیسے ہیں
ہمارے روز و شب سارے کے سارے ایک جیسے ہیں

(اختر امان)

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بجھا ہوا
اس دور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا
ہارنے والوں نے اس رخ سے بھی سوچا ہوگا
سر کٹانا ہے تو ہتھیار نہ ڈالے جائیں

(جمال احسانی)

تھک ہار کے بیٹھیں تو کہاں، دھوپ کڑی ہے
رستے میں کوئی سایۂ دیوار نہیں اب

(سید آل احمد)

اس یقینی اور بے یقینی کی کیفیت میں اس دور کا انسان تنہائی میں پناہ لینے کو ترجیح دیتا ہے۔ ۶۰ء کی دہائی میں جہاں زندگی کی تیز رفتاری نے انسان کو تنہا کر دیا، وہیں ۷۰ کی دہائی میں اس بے یقینی کی کیفیت نے اس تنہائی کے کرب کو مزید بڑھا دیا۔ اس معاشرے نے انسان کو حساس بنا دیا ہے اور ہر لمحہ ملنے والے نئے دکھوں نے انسان کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ایک اور اہم موضوع جو غزل کا حصہ بنا وہ بے چہرگی کا احساس ہے۔

یہ احساس اس معاشرے کے ہر فرد کی شخصیت کا حصہ دکھائی دیتا ہے جب وہ فرد تنہائی میں اپنے حالات پر نظر کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے جو مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی شناخت کیا ہے؟ یہ بے چہرگی کا احساس دراصل اسی شکستگی کی دین ہے جو اس دور میں مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کی صورت میں ملی۔ حنیف کیفی لکھتے ہیں:

احساسِ تنہائی کے ساتھ ساتھ آج کے معاشرے نے انسان کو جن احساسات و کیفیات اور مسائل و معاملات

سے دوچار کیا ہے ان میں انتشارِ ذات وتحفظ ذات کے مسائل، پاس انا اور شکستِ انا کا احساس، بے سمتی و کج رفتاری، بے مقصدی ولا حاصلی، بے چہرگی اور ایک چہرے پر کئی چہروں کی فریب کاری، ہجرت، بے گھری اور در بدری وغیرہ شامل ہیں۔(۲)

ستر کی دہائی کے اس المناک حادثے نے اس دور کے شعرا کو مجبور کر دیا کہ وہ معاشرتی کرب اور اذیت کو اپنا موضوع بنائیں اس کرب میں نہ صرف شاعر بلکہ معاشرے کا ہر فرد گرفتار تھا۔ شناخت کا بحران اس دہائی میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بے چہرگی اور شناحت کے بحران کا رجحان عام نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو بنگالی مشرقی پاکستان میں رہ گئے انھیں یہاں کے باشندے ہونے کا حق حاصل نہ ہو سکا اور جو مغربی پاکستان کے رہنے والے بنگلہ دیش میں تھے انھیں وہاں مکمل حقوق حاصل نہ تھے۔ ان حالات میں اپنے ہی ملک میں بیگانوں کی سی کیفیت نے شناخت کے بحران اور بے چہرگی جیسے موضوعات کو جنم دیا جنھیں غزل میں بھی بیان کیا گیا۔

یاد آتی تو ہے شناخت مگر
انتہا ہو گئی ہے غفلت کی

(سلیم کوثر)

۷۰ کی دہائی اردو غزل میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دہائی میں جدید شعرا نے انفرادی سطح پر نئے امکانات اور نئے رجحانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی اس دہائی کی غزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گہرا تاریخی شعور نظر آتا ہے۔ سیاست دانوں کی غفلتیں جن کی بنا پر ملک دو حصوں میں بٹ گیا ایسی صداقت ہے جس کو قبول کرنا آسان نہ تھا۔ اس دہائی کے شعرا نے ان حالات میں ان تمام اثرات کو غزل کا حصہ بنایا جو ملک کے دولخت ہو جانے کی صورت میں سامنے آئے۔ غزل میں ہمیں اس عہد کی تمام جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

جدید ادب کی طرح جدید غزل کے مطالعے سے بھی اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ حاضر کے آشوب و آشفتگی کی نوعیت کیا ہے۔ انسانی شعور و شعار میں کون سی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ آج کی غزل میں کس طرح یا کس حد تک محبت کی جگہ معاشرے نے، مذہب کی جگہ سیاست نے اور شعور کی جگہ جبلت نے لے لی ہے۔ انسانی زندگی کتنی بے معنی یا لایعنی تصور کی جا رہی ہے۔ انسان کن زلزلوں سے گزر چکا ہے اور کن زلزلوں کی زد میں ہے۔ اس کے ساتھ تاریخ نے کیا کچھ کیا ہے اور اس کی تقدیر کیا کچھ کرتی نظر آتی ہے، غرض کہ جس طرح عہد رواں کی روح کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کا مطالعہ ضروری ہے اسی طرح غزل کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔(۳)

۱۹۷۱ء کے بعد کی شاعری کی فضا اس سیاسی اتار چڑھاؤ سے عبارت ہے جس نے ہماری زندگیوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر کیا ہے۔ ملک میں پے در پے مارشل لا کے نفاذ سے جہاں معاشرے میں شدید گھٹن اور اضطراب پیدا ہوا وہیں یہ کیفیت شاعری میں اور خصوصاً غزل کا موضوع بن کر سامنے آئی۔

وہی ہے جس کا موسم گھٹن بدلنے سے

فضا بدلتی نہیں پیرہن بدلنے سے

(سلیم کوثر)

سلگے گا دل زار، جلن اور بڑھے گی
محسوس یہ ہوتا ہے گھٹن اور بڑھے گی
سوچوں کی تمازت سے جھلس جائے گا ہر شخص
احساس کے صحرا کی جلن اور بڑھے گی

(اقبال ساجد)

سزا قبول مگر اتنا جان لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے بااختیار وہ بھی تھے

(ظہور نظر)

سینہ ظلم میں ہونا ہے ترازو اک تیر
کاش ایسا ہو کہ اس بار کماں میری ہو

(افتخار عارف)

سواد شہر سے بھی خاک اڑ گئی جن کی
کبھی تمہاری طرح شہر یار وہ بھی تھے

(ظہور نظر)

ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ایک سیاسی جبر کی فضا طاری ہوگئی۔ ہر طرف بے چینی، افراتفری، کرب و اضطراب کا دور دورہ تھا ہر شخص غیر مطمئن اور رنجیدہ تھا آخر اس کی وجہ کیا تھی۔ ہماری اپنی غلطیاں یا ان کی غلطیاں جن کے ہاتھوں یہ ملک سونپا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک ان سیاسی غلطیوں کا سلسلہ جاری ہی رہا۔ ۱۹۷۷ء میں لگنے والے مارشل لاء نے معاشرے میں مزاحمتی رویے کو تیز تر کر دیا اس مارشل لا نے پوری قوم کو پھر سے اندھیرے میں دھکیل دیا تھا اور روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> تہتر کے آئین نے ملک میں قانون کی حکمرانی کی راہ ہموار کر دی اور سمت کا احساس ہونے لگا لیکن ۱۹۷۷ء کے مارشل لا نے ملک کو پھر اندھیری راہ پر دھکیل دیا۔ اس مارشل لا کا کوئی قانونی، اخلاقی اور آئینی جواز نہ تھا۔ آئین موجود تھا۔ پی این اے اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا تھا لیکن پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت مارشل لا لگا دیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین زمانہ ہے۔ اس مارشل لا نے جہاں ایک قومی ہیرو کو پھانسی پر لٹکا کر ہیرو اور سمت کا تعین دھندلا دیا وہاں سیاسی عمل کو بے اثر بنانے کے لیے لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصّبات کو ہوا دی۔ افغانستان کے نام نہاد جہاد نے ملک کو جس جہادی کلچر سے آشنا کیا اور تشدد کی جو پنیری لگائی آج پورا پاکستان اس کی فصل کاٹ رہا ہے۔ (۴)

ان حالات میں ملکی فضا سنگین صورت حال اختیار کر گئی۔ ہر طبقۂ فکر نے اپنے اپنے پلیٹ فارم سے اپنے اپنے انداز میں اس پیچیدہ اور نازک صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے انسان کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع بنایا۔ سیاست دانوں کے قول و فعل میں تضاد نے آزادی کے بعد مسلمانوں کے عروج کی خواہش اور اسلامی روایات اور اپنے وطن کو ترقی دینے کی خواہش پر گہری ضرب لگائی۔ بے نام اداسیوں اور ہیجانی کیفیات کو جنم دیا۔ پاکستانی قوم کو قنوطیت کی راہ پر ڈال دیا گیا۔ سیاسی شورش اور ذہنی الجھنوں کو بڑھایا اور احساس تحفظ کو مجروح کیا گیا۔ ان حالات میں غزل میں گہری قنوطیت ملتی ہے۔ شعرا نے ان حالات میں جو کچھ محسوس کیا اسے بیان کر دیا جس سے غزل میں ماتمی فضا چھا گئی۔ ان حالات نے فرد کو ایک انجانے خوف میں مبتلا کر دیا۔ بے سمتی کا یہ احساس غزل میں بھی موضوع بنا۔

یہی کہا تھا یہاں جبر کی حکومت ہے
تو اس خطا پہ ہمیں شہر سے نکال نہیں

(اظہر جاوید)

دیواروں میں سہمے بیٹھے ہیں کیا خوب ملی ہے آزادی
اپنوں نے بہایا خون اتنا ہم بھول گئے بیگانوں کو

(حبیب جالب)

بستی میں کس عذاب کے ڈر جاگنے لگے
شب بھر پسِ فصیل بھی گھر جاگنے لگے

(جلیل عالی)

کون سا فخر ہے جس پر کریں گردن اونچی
ہم کو اس دورِ خرابی نے دیا کیا ہے

(ریاض مجید)

خوف موقوف نہیں رات کی تاریکی پر
دل کبھی دن کے اجالے سے بھی ڈر جاتے ہیں

(ارشد ملتانی)

سخت تذبذب میں ہوں، اس سے اگر اپنا حق
چھینوں تو مجرم بنوں، مانگوں تو ملتا نہیں

(صابر ظفر)

کیا بتائیں فصلِ بے خوابی یہاں بوتا ہے کون
جب در و دیوار جلتے ہوں تو پھر سوتا ہے کون

(سلیم کوثر)

اے قافلے کے لوگو ذرا جاگتے رہو
سنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

(اقبال عظیم)

۶۰ء کی دہائی تک وہ رنگ بھی غزلوں میں آتا رہا جسے اس سے قبل رنگِ میر یا میر کی تقلید کہا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کا ردِ عمل بھی سامنے آتا ہے۔ شاعروں نے میر کے محبوب موضوعات تصوف، درویشانہ زندگی اور غم وحزن کی کیفیات کو میر کی اس تقلید میں ذرا الگ انداز پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کے ہاں میر کے اتباع میں ایک جداگانہ انداز نظر آتا ہے۔

میؔر ملیں تو یہ ان سے کہیو اب بھی اس نگری میں
تیرے بہانے اپنے فسانے کہتے ہیں دکھیارے لوگ

(شمیم احمد)

جیوں رستے ہنستے بستے پلک جھپکتے دھول ہوئے
شہر جہاں آباد تھا پہلے آج وہاں سناٹا ہے
آنکھ سے پھر اک آنسو ٹپکا، اور ایک جگ بیت گیا
لیکن تیری یاد کا سایہ اب بھی گہرا گہرا ہے

(رساؔ چغتائی)

اس نگری میں چلتے پھرتے پتھر ہیں کیا جانے تُو
کون سی آس لیے پھرتا ہے گلی گلی دیوانے تُو
بھاگ میرے سائے سے پیارے لیکن وہ دن دور نہیں
پہروں چھپ چھپ کر روئے گا خود میرے افسانے تُو

(شہرت بخاری)

۱۹۷۰ء کے بعد کی غزل میں انفرادی اور اجتماعی دونوں رجحانات ملتے ہیں۔ اس میں امید اور خوشی بھی ہے اور بے دلی و آنسو بھی۔ خواہشیں بھی ہیں اور مسکراہٹیں بھی اور بیزاری و بے چینی بھی۔ ۷۰ کی غزل میں صرف ذاتی احساسات کی عکاسی نہیں کی گئی بلکہ اجتماعی سطح پر جو ذہنی انتشار و احساس محرومی پروان چڑھ رہا تھا اس کا بیان بھی ملتا ہے۔ پاکستانی غزل گو شاعروں نے ذاتی طور پر اس احساسِ شکست کو برداشت کیا جو اس دہائی کا المیہ بن کر سامنے آیا اور اس کا بھرپور اظہار غزل میں بھی کیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

......اس ذہنی انتشار اور احساس محرومی کی جڑیں دراصل ملک کے پریشان کن سیاسی حالات میں مضمر تھیں۔ اپنے گردوپیش کی تاریکی میں نئی امیدوں کی روشن شعاعوں کو عالمِ وجود میں لانے کی کوشش میں سیاسی استحکام اور شہری معاشرتی آزادی شعرا کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی تھی۔ اگر اس دور میں ہمارے یہاں سیاسی استحکام ہوتا تو ہماری شاعری پر اس کا بڑا دوراس گہرا اور صحت منداثر پڑتا۔ ہمارے شعرانے تو اس عبوری دور

میں یہی دیکھا کہ چاروں طرف سیاسی گٹھ جوڑ تھے اور اعلیٰ ترین حلقوں میں سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ چنانچہ
اس طرح محرومی اور پر احساس شکست چھا گیا۔(۵)

پاکستان کے لیے یہ دہائی بے حد مسائل لے کر سامنے آئی۔ ایک طرف سیاسی اونچ نیچ اور دوسری طرف بیرونی دباؤ۔ بھارت اور روس کی دوستی خاص طور پر مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے لیے بڑا مسئلہ تھی۔ پاکستانی غزل پاکستانی تاریخ کے ان تمام بحرانوں سے گزرتی رہی اور پاکستانی تاریخ کی ہم سفر بنی رہی۔ان مسائل نے جہاں پاکستان کے رہنے والوں میں احساسِ شکست کو جنم دیا وہیں انھیں انجانے خوف اور وہم میں بھی مبتلا کیا۔شعرا نے اس احساسِ شکست کو بھی غزل کا موضوع بنایا جو اردو غزل کے لیے ایک نیا موضوع تھا۔

ریزہ ریزہ میں بکھرتا گیا ہر سو محسن
شیشہ شیشہ مری سنگینیِ فن ٹوٹی ہے

(محسن نقوی)

کب رات ڈھلی، یہ تو اندھیروں کا سماں ہے
ویران ہیں صحرا کی طرح خواب ہمارے

(حبیب جالب)

بٹ جائے کرچیوں میں نہ تیرا وجود بھی
مجھ کو نہ توڑ دیکھ تیرا آئینہ ہوں میں

(زہیر کنجاہی)

پلک جھپکتے ہی نقشہ بدل گیا کتنا
نظر کے سامنے گھر کی جگہ کھنڈر آیا

(آصف ثاقب)

ان سے کہو وہ زحمتِ آزار مت کریں
میرے لیے تو صبح کے اخبار ہیں بہت

(عطاالحق قاسمی)

۱۹۷۰ء کے بعد نمایاں ہونے والے شعرا نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کا بھرپور نقشہ پیش کیا ہے۔ان شعرا کو عصری مسائل کا ادراک بھی تھا اور شعور بھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان مسائل کا بھرپور ذکر کیا ہے اور خصوصاً غزل گو شعرا نے عصری مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر بشیر سیفی لکھتے ہیں:

۱۹۷۰ء کے بعد نمایاں ہونے والے شعرا نے فرد اور معاشرے کی مختلف سطحوں پر ہونے والی شکست و ریخت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور فنی پختگی سے شعر کا جامہ پہنایا۔نئی نسل کے شعرا کی غزلوں میں......معاشرتی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ زمین، وطن سے محبت کا جذبہ بھی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ آج کا شاعر

وارفتہ مزاج نہیں بلکہ عصری مسائل کا ادراک رکھنے والا باشعور فنکار ہے جسے اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس ہے۔(۶)

۷۰ کی دہائی میں غزل میں ہمیں ایک نئی راہ یا ایک نیا موضوع نظر آتا ہے وہ ہے اسلامی تہذیب اور اسلامی تشخص کا بیان۔ شعرا نے شعوری طور پر اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ سے استعاروں کو اپنی غزل میں استعمال کیا ہے اور ان استعاروں کی مدد سے اپنے عہد کے آشوب کو نئے معنی دینے کی سعی کی ہے۔اسلامی تہذیب اور تاریخ سے مثالیں اور کردار لے کر تلمیحی انداز میں دھندلے ہوتے ہوئے اسلامی تشخص کو پھر سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں شعرا کا ایک گروہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے تشکیک کے شکار اسلامی تشخص کو اپنی غزل کے ذریعے پھر سے پہچان دینے کی کوشش کی ہے۔ثروت حسین، جمال احسانی، سلیم کوثر اور غلام حسین ساجد وغیرہ نے تلمیحی انداز اختیار کر کے ملی اور قومی تشخص کے احیا کی سعی کی ہے۔

ثروت حسین کے ہاں یہ احساس شدت کے ساتھ ملتا ہے۔اردو غزل اور خصوصاً ۷۰ کی دہائی کی غزل میں ہمیں غزل کے گم شدہ لہجوں اور گم شدہ لفظوں کی بازیافت نظر آتی ہے۔ثروت حسین کے ہاں ہمیں اسلامی تشخص کو ابھارنے کی جو کوشش ثروت حسین نے کی ہے اس کے تتبع میں ہمیں یہ موضوعات جمال احسانی، اسلم کوثر اور غلام حسین ساجد کی غزل میں بھی ملتے ہیں لیکن ان شعرا نے ثروت حسین کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی منفرد پہچان بھی قائم رکھی ہے۔ان کے ہاں ہمیں تہذیبی اور تاریخی استعارے ملتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی مقامی اقدار اور تہذیب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔اور یہ اپنی اقدار اور تہذیب میں پناہ لیتے نظر آتے ہیں اور قدرے پُر امید نظر آتے ہیں۔ان شعرا کے ہاں ہمیں غزل کی روایت کا انداز بھی نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور پریشانیوں کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے آشوب کو محض رونا دھونا بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اس کو نئی طرز سے سامنے لائے ہیں۔

گونجتی گلیوں میں ہے ان کے خیالوں کی چاپ
گشت و گلیم آشنا پاک پیغمبرؐ ترے

(ثروت حسین)

نگاہ کی آخری حدوں تک زوال کی شام بہہ رہی ہے
زمین کے ٹوٹتے کنارے خروش بیباک پر نظر کر

(ثروت حسین)

اب کس سے کہیں بھول گئے ہیں نگر اپنا
جنگل کے اندھیروں میں کٹا ہے سفر اپنا

(ثروت حسین)

دن بھر گہرا سناٹا رہتا ہے مگر
شب بھر ایک چراغ پسِ دیوار جلے

(جمال احسانی)

موسم سنگ زنی کی ہے خبر گرم جمال
دست و بازو کبھی دیکھوں تو کبھی سر دیکھوں

(جمال احسانی)

عکس شاید ہے سلامت پسِ آئینۂ جاں
اپنی جانب کئی بڑھتے ہوئے شکر دیکھوں

(جمال احسانی)

یہاں یہ قافلے کے لٹنے کا ہے ڈر
یہاں مگر ضروری ہے پڑاؤ بھی

(جمال احسانی)

راستے کب گرد ہو جاتے ہیں اور منزل سراب
ہر مسافر پر طلسمِ رہ گزر کھلتا نہیں

(سلیم کوثر)

یوں ہی دشمن نہیں در آیا مرے آنگن میں
دھوپ کو راہ ملی پیڑ کی عُریانی سے

(سلیم کوثر)

اایک ایک کر کے خود سے بچھڑنے لگے ہیں ہم
دیکھو تو جا کے قافلہ سالار کون ہے

(سلیم کوثر)

اس دہائی کی شاعری میں واقعاتِ کربلا کا بیان بھی نظر آتا ہے۔کربلا اور اس سے متعلق موضوعات کو شعرا نے اپنے عہد سے مطابقت پیدا کر کے پیش کیا ہے۔واقعۂ کربلا کو تلمیح سے زیادہ استعارے کے طور پر غزل میں برتا گیا ہے۔جدید شعرا نے اس طرز اظہار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور معاشرتی حالات کے خلاف احتجاج کو واقعات کربلا کے تناظر میں غزل کا حصہ بنایا ہے۔اردو غزل میں واقعات کربلا کو اپنے عہد کے آشوب سے ملا کر جو معنوی وحدت پیدا ہوئی ہے۔واقعہ کربلا کو شعری استعارے کے طور پر استعمال کرنا غزل کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔کربلا اردو غزل میں حق وصداقت کی آواز کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔لیکن ۷۰ کی دہائی میں سانحہ کربلا شعری استعارے کے طور پر سامنے آیا۔

کربلا کا استعارہ غزل میں مختلف شعرا کے ہاں نظر آتا ہے لیکن افتخار عارف کا نام اس حوالے سے سب سے زیادہ اہم ہے۔انھوں نے کربلا کے واقعے کی جزئیات کو غزل کا حصہ بنا کر ان سے نئے معنی اخذ کیے ہیں۔انیس اشفاق لکھتے ہیں ''۷۰ تک آتے آتے نئی غزل میں ایک نئی طرح کی تبدیلی آئی۔اس تبدیلی کے ماتحت غزل میں کربلا کو شعری استعارے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔''(۷) ۷۰ کی دہائی کا معاشرہ جس المیے سے دوچار ہوا۔وہ لوگوں کے لیے کربلا کے واقعے سے کسی طور

کم نہ تھا اور ۷۰ کی دہائی کے المیے کے لیے کربلا سے موزوں کوئی استعارہ نہیں تھا۔ کربلا کے استعارے کو اردو غزل کی زینت بنانے میں افتخار عارف کا نام اہم ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ دوسرے شعرا نے بھی شعوری طور پر یہ موضوع اپنایا ہے۔

نہ جانے کون سے ترکش کے تیر کب چل جائیں
نشانِ مہر کمانِ سپر میں رکھا جائے

(افتخار عارف)

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

(افتخار عارف)

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

(افتخار عارف)

آلِ علی کا جیسے لہو سرد ہو گیا
بستی ہر ایک کوفہ و بغداد ہو گئی

(شہرت بخاری)

جز حسین ابنِ علی، مرد نہ نکلا کوئی
جمع ہوتی رہی دنیا سرِ مقتل کیا کیا

(فارغ بخاری)

یہ فقط عظمتِ کردار کے ڈھب ہوتے ہیں
فیصلے جنگ کے تلوار سے کب ہوتے ہیں

(سلیم کوثر)

خبر ہے گرم کہ ہے آج میرے قتل کی رات
کہاں گئے مرے بازو کہاں گئے مرے ہات

(صابر ظفر)

جھلک رہا ہے کنارِ شفق سے تابہ افق
ابد کنارا ہوا خونِ رائیگاں نہ گیا

(ثروت حسین)

اس واقعے نہ دیکھ لیا کربلا کا دن
اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

(عبیداللہ علیم)

ہر صدا انصاف کی بے بس صدا بنتی گئی
اے خدا تیری زمیں کیوں کربلا بنتی گئی

(ریاض مجید)

تمام وسعتِ صحرا تشنگی میری
تمام سلسلۂ دجلہ و فرات مرا

(عشرت ظفر)

جشنِ رسن و دار کا، کل آخری دن ہے
کل میں نہیں ہوں گا، مری سچائی تو ہو گی

(سلیم کوثر)

موت کی نیند سلا دے خالد کن ہاتھوں کی تھپک
نیزوں پر سر کون اچھالے یہ ہم کیا جانیں

(خالد احمد)

۷۰ کی دہائی کی غزل میں جہاں حالات کی بے رحمی، شکست وریخت، ٹوٹ پھوٹ اور جبری واقعات کا بیان ملتا ہے وہیں اس صورت حال کے خلاف ردعمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ ردعمل کی دوسری صورت سماجی ناانصافیوں سے بچ کر تہذیب کے دامن میں پناہ لینا ہے۔ ۷۰ کی غزل میں اسلامی تہذیب و تشخص کے ساتھ ساتھ ہمیں مقامی جنگو تہذیب کے بیان کی بھی ایک قومی روایت نظر آتی ہے۔ شعرا نے اپنے تاریخی شعور کو استعمال میں لاتے ہوئے عظیم مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال اور شاہی عبرت ناک سانحے کے خلاف ردعمل کے طور پر اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق کے مطابق:

> اردو غزل نے روایت سے وابستگی کے باوجود ہر دور میں شعری مواد کا نئے عناصر سے ارتباط قائم کیا ہے۔ نئے فکری اور سماجی عوامل ہمیشہ اردو غزل کے خاکے میں رنگ بھرتے رہے ہیں اور زندگی کے آگے بڑھتے ہوئے شعور نے مسلسل ماضی کے فرسودہ رجحانات سے اپنی جنگ جاری رکھی ہے، نئے حالات کی روشنی میں نئی سچائیوں کی تلاش کا کام اردو غزل نے برابر سرانجام دیا ہے۔ اردو غزل کے تہذیبی رجحانات اپنے معاشرہ کے روحانی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کو پیش کرتے رہے ہیں۔ (۸)

۷۰ کی دہائی کی غزل میں جو چیز فوری طور پر اپنی جانب متوجہ کراتی نظر آتی ہے وہ شعرا کا تاریخی اور تہذیبی شعور ہے۔ کچھ شعرا نے اسے مذہبی شعور کے طور پر شاعری میں متعارف کرایا اور کچھ نے قریبی سیاسی، سماجی اور تہذیبی ماحول کی عکاسی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شعرا نے اپنی مقامی تہذیب سے وسعت پا کر فکری مضامین کو نئی طرز سے پیش کیا ہے۔ ان شعرا نے اپنے عہد کے انتشار اور بے چینی کو تہذیبی استعاروں کی مدد سے پیش کیا ہے۔ تاریخی ادراک کو معاشرتی مسائل کے خلاف ردعمل کے طور پر پیش کرنا نہ صرف موضوعاتی سطح پر غزل کو نیا رخ عطا کرتا ہے بلکہ فنی حوالے سے بھی نئی لفظیات کے سامنے آنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ یہاں تاریخ کے واقعات کو محض دہرایا نہیں گیا بلکہ ان کو استعارہ بنا کر اپنے عہد کے مسائل سے مقابلہ کرنے کی راہ

تلاش کی گئی ہے۔ ۷۰ کی دہائی کی غزل میں اس طرز اظہار کے حوالے سے اظہار الحق، خالد اقبال یاسر کے نام اہم ہیں۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> آج کی غزل کے نئے منظرنامے پر محمد خالد، غلام حسین ساجد، ثروت حسین، صابر ظفر، جمال احسانی، افضال احمد سید، شاہدہ حسن، جلیل عالی، سلیم کوثر، خالد اقبال یاسر اور محمد اظہار الحق کو سرگرم عمل دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کلاسیکی غزل کی روایت سے جو قدم اکھڑ چلے تھے، ایک بار پھر سنبھل گئے ہیں اور روایت کے شعور کی ساکھ بحال ہو رہی ہے۔ (۹)

اسی کنارۂ حیرت سرا کو جاتا ہوں
میں اِک سوار ہوں، کوہِ ندا کو جاتا ہوں

(ثروت حسین)

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے، مجھے کھا گئے

(خورشید رضوی)

خارِ طلسم ہوں نہ کہیں اس کے جسم میں
بیٹھے جو تیری چھت پہ کبوتر ہی اور ہو

(افضال نوید)

حصار چاٹتے رہنا ہے کارِ بے مصرف
شگاف ڈال کے زنداں سے در نکالتے ہیں

(سلیم شاہد)

اے خردمندسن ہم بھی دو بھائی تھے، وہ جو حاکم بنے ہم جو رسوا ہوئے
وہ ادھر لعل و گوہر میں تلتے رہے، ہم ادھر لعل لو گوہر اگلتے رہے

(سجاد باقر رضوی)

بوڑھے جادوگروں کا تازہ طلسم
کِن پرندوں کو مار کر توڑیں

(علی اکبر عباس)

شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں، کتنے در آتے ہیں

(ثروت حسین)

غلام بھاگتے پھرتے ہیں مشعلیں لے کر
محل پہ ٹوٹنے والا ہو آسماں جیسے

(اظہار الحق)

کنیزیں پاس کھڑی مورچھل ہلاتی تھیں
کہانی کہتے تھے ناخفتہ انکھڑیوں کے رنگ

(خالد اقبال یاسر)

ایک دن ساجد اسے پہچان لینا ہے مجھے
ایک دن کھل جائے گا وہ ساتویں در کی طرح

(غلام حسین ساجد)

ا
یک دوست ترا شہر بھی ہے شہرِ طلسمات
چھو کر جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا

(خالد احمد)

ردعمل کا ایک اچھوتا انداز ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کے بیان کے طور پر بھی نظر آتا ہے۔ ۷۰ کی دہائی کی غزل میں ہمیں ردعمل کا یہ منفرد انداز ہمیں جبریت اور عدم تحفظ کے خلاف سکون کی تلاش کے طور پر نظر آتا ہے۔ ۷۰ کی دہائی کے شعرا نے اپنے اپنے طور پر ردعمل ظاہر کیا ہے جس نے غزل کو نئی معنویت بخشی ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے لاکھوں گھرانوں کو ہجرت کی صعوبت برداشت کرنا پڑی نہ صرف ہجرت بلکہ عدم تحفظ، بے راہ راوی اور احساس شکست نے انسان کو توڑ پھوڑ کا شکار بنا دیا تو اس نے اس صورت حال کا سامنا کرنے کے بجائے راہ فرار تلاش کی۔ مقابلہ کرنا اس کے لیے قدرے مشکل فعل تھا جبکہ اپنی توجہ کسی اور جانب مبذول کرنا اس کی نسبت آسان کام تھا جو ہمیں اس دہائی کی غزل میں مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ پنجاب کی خالص تہذیبی روایت کا بیان اس ردعمل کی ایک اچھوتی صورت کے طور پر سامنے آیا۔ جہاں انسان مل جل کر زندگی کے معمولات کو سرانجام دینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے سوچ کے دھارے محدود ہوتے ہیں۔ اپنا گھر، اپنے خاندان کی فکر ہی ان کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ ان کے لیے سب سے اہم بات یہی ہوتی ہے کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے خوشی اور آسودگی کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ جہاں جذبوں میں صداقت اور خلوص موجود ہوتا ہے۔ کسی کی پریشانی اور تکلیف پر سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری پنجاب کی دیہی تہذیب کی روح ہے جسے علی اکبر عباس نے ردعمل کی نئی راہ کے طور پر اختیار کیا اور غزل میں اس کو برتا ہے اور غزل میں ایک نئے موضوع کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے دیہی تہذیب کے ورثے کو اپنا موضوع بنایا ہے جس سے دیہی زندگی کی علامت اور استعارے اردو غزل میں نئے موضوعات کو سامنے لانے کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔

۷۰ کی دہائی سے پہلے بھی پنجاب اور اس کی ثقافت کو غزل میں موضوع بنایا گیا ہے لیکن جس انداز میں علی اکبر عباس نے

اس کو متعارف کرایا ہے اس سے پہلے نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

علی اکبر عباس سے پہلے بھی پنجاب کی ثقافت شاعری میں سموئی گئی ہے مگر اس شاعری میں پنجاب کا ظاہر نظر آتا ہے یعنی محض اس کا منظر نامہ، درخت، فصلیں اور پرندے مگر پنجاب کی ثقافت کبھی اتنی زندہ و تابندہ ہو کر سامنے نہیں آئی تھی۔(۱۰)

علی اکبر عباس نے پنجاب کی ظاہری صورت کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کو بھی غزل میں سمویا ہے اور پنجاب کی سرزمین کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

اُبلوں کے پھول منڈیروں پر صحنوں میں بھوری پنج کلیاں
اور چاند مکئی کی روئی پر تاروں سی مکھن کی ڈلیاں

ذرا میٹھی میٹھی دھوپ چڑھے چھت پر آئیں ساسیں بہوئیں
سر تیل لگانے کی جلدی کہیں بال سکھانے کی جلدی

کھیتوں میں گندم نے سوچا پالی کے ہاتھ کروں پیلے
تیار ہوئے گہنے لئے، چھٹیں، گاھبے، دانتی، ڈھولیں

یہ رہٹ سدا چلتے ہی رہیں یہ لوگ سدا ہنستے ہی رہیں
اس بھاگاں والی دھرتی کو یہ دی ہے دعا پیراں ولیاں

فرار یا ردعمل کی چوتھی اور آخری صورت ہمیں جنس میں پناہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جنس کا موضوع اردو غزل کے لیے نیا موضوع نہیں ہے۔ ۷۰ کی دہائی کی غزل میں ہمیں جنس کا موضوع ایک نئے انداز میں سامنے آتا نظر آتا ہے۔ ایک طرف ملکی فضا مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور مارشل لا کے زیر اثر سوگوار نظر آتی ہے تو دوسری طرف شاعری میں جنسی جذبات و احساسات کے بیان میں شدت نظر آتی ہے۔ جلیل عالی اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

۷۰ کی دہائی کی غزل میں جو نئی طرز کی رومانوی فضا سامنے آتی ہے۔ وہ اس عہد کے حالات کے خلاف ردعمل کی ایک انوکھی صورت ہے۔ اس میں کسی حد تک مغربی ماڈرن ازم کا دخل بھی ہے۔ اس دہائی کے شعرا نے جنس اور جنسی جذبات کو موضوع بنا کر اپنے جذبات کی تشفی کی ہے۔ کیونکہ جنس قدرے زیادہ سکون اور آسودگی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔(۱۱)

۷۰ کی دہائی کی غزل میں رومانوی طرز کی جو نئی فضا سامنے آئی ہے اس نے نہ صرف مرد شعرا بلکہ خواتین شعرا کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس دہائی کی غزل میں ہمیں خواتین شعرا کے ہاں عشقیہ جذبات کی ترجمانی میں خواتین کا لہجہ ہی نظر آتا ہے۔ جدید اردو غزل انسانی زندگی کے ارتقا کی تعبیر ہے۔ خصوصاً ۷۰ کی دہائی کی غزل میں ہمیں خواتین شعرا کی زبانی نسائی جذبات کے اظہار کی

ایک منفرد صورت نظر آئی ہے۔اس سے پہلے ہمیں اردو غزل میں نسائی جذبات کی ترجمانی اس صورت میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید وہ پابندیاں تھیں جو معاشرہ عورت پر عائد کرتا ہے۔

جدید غزل میں جہاں عشق کا بدلا ہوا انداز نظر آتا ہے وہاں دوسرا نمایاں پہلو نسائیت کا ہے۔ یہ رجحان واضح طور پر ۷۰ کی دہائی کی غزل میں سامنے آیا ہے۔افتخار عارف اس حوالے سے یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ۷۰ کی دہائی کی غزل کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح عورت اس دہائی میں کھل کر بولی ہے اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عالمی ادب میں بھی خواتین اپنے احساسات و جذبات کی کھل کر ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔(۱۲)

۷۰ کی دہائی کی غزل میں نسائیت کے رجحان کی نمائندگی کے حوالے سے پروین شاکر اور کشور ناہید کے نام اہم ہیں۔ انھوں نے عورت کے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اور جنس کو ہوس یا بیماری نہیں بننے دیا بلکہ پاکیزگی کے ساتھ مرد اور عورت کے جذبات کو بیان کیا ہے۔۷۰ کی دہائی کی غزل میں نسائیت ایک واضح رجحان کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے اور ان شاعرات نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف عورتوں کے جذبات بلکہ ان کی نفسیات اور مسائل کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔شاید یہ اس معاشرے کے اس رویے کے خلاف آواز تھی جو مردوں کی بالا دستی کو ظاہر کرتا تھا۔مردوں کے ذریعے عورتوں کا استحصال ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔اس کے خلاف آواز بلند کرنا اس مردانہ معاشرے میں کوئی آسان بات نہ تھی۔خواتین شعرا نے شعوری طور پر اس کاوش میں حصہ لیا ہے۔

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

(کشور ناہید)

کچھ یوں بھی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

(کشور ناہید)

میں سچ کہوں گی پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

(پروین شاکر)

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

(پروین شاکر)

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

(پروین شاکر)

جس کا جسم میرا ہے اس کا دل بھی میرا ہو
جب کبھی تجھے دیکھا یہ خیال آیا ہے

(ثمینہ راجہ)

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا

(زہرا نگاہ)

آنا کسی کا آج بھی ممکن نہیں مگر
کیوں دیر سے سنگار کیے جا رہی ہوں میں

(نجمہ اخلاق)

۷۰ کی دہائی کی غزل میں نہ صرف خواتین کی طرف سے جذبات کے بیان میں کھلا پن اور شدت نظر آتی ہے بلکہ مرد شعرا نے بھی اپنے احساسات کی ترجمانی میں قدرے کھل کر اظہار کیا ہے جو اس سے پہلے کہیں اردو غزل میں نہیں ملتا۔ گویا ۷۰ کی دہائی کی غزل پر رومانویت پوری آب و تاب سے چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

(افتخار عارف)

محبتوں کی بلندی پہ ہے یقین تو کوئی
گلے لگائے مری سطح پر اتر کے مجھے

(جمال احسانی)

یہاں تک آ تو گئے آپ کی محبت میں
اب اور کتنا گنہگار کرنا چاہتے ہیں

(سلیم کوثر)

اسی دور میں عشق کا ایک رویہ وہ بھی ہے جس میں جنسی حوالہ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> شاعری میں عورت اور مرد کے رشتے کی دوسری سطح وہ ہے جہاں محبت میں ''مکالمے'' کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ اوّل اوّل جسمانی سطح پر ابھرتا ہے۔ جسم کی بھی تو ایک اپنی زبان ہے جو بولی جانے والی زبان سے ایک الگ مزاج رکھتی ہے۔۔۔ مگر شاعری پتھر کے بجائے لفظ کو استعمال کرتی ہے۔۔۔ اور لفظ بول چال کی خشتِ اوّل ہے۔ لہٰذا شاعری نے جسموں میں ہونے والے مکالمے کو بھی خود میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ مکالمہ مرد اور عورت کی باہمی کشش کا زائیدہ ہے۔ (۱۳)

تمام شب کسی خوشبو نے دی مجھے آواز
تمام شب مجھے اپنا کسی چمن نے کہا

(رضی اختر شوق)

وہ رنگ ہے کہ بکھرنے کی آرزو تھی اُسے
میں سنگ ہوں کہ مجھے شوق ہے پگھلنے کا

(ظفر اقبال)

نکل کے وہ مری آغوش سے گیا ہے تو میں
ہوائے موجۂ گل کی طرح مہکتا ہوں

(محسن احسان)

وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا ہے مجھے

(احمد فراز)

شاید مِرے بوسوں میں رنگوں کے خزانے تھے
وہ صورتِ افسردہ گلنار نظر آئی

(ساقی فاروقی)

مجموعی طور پر ۷۰ کی دہائی کی غزل کے موضوعات کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ہمیں سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کی تصویریں ملتی ہیں تو دوسری طرف ہمیں اس صورت حال سے فرار کی صورت بھی نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر شاہین مفتی:

> گذشتہ ستر پچھتر برسوں میں چاہے کوئی شاعر ترقی پسند کہلائے یا رجعت پسند، انفرادیت کی ڈفلی بجانے والا ہو یا اجتماعیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والا، داخلی اظہار پر جان دیتا ہو یا خارجی اظہار کا شیدائی، سب کے عصری مسائل قریب قریب ایک سے ہیں، سب فرار کے راستوں پر گامزن ہیں۔۔۔(۱۴)

۷۰ کی دہائی کے شعرا ایک طرف مذہبی، تہذیبی اور مقامی تہذیب کے گم ہونے کا دکھ لیے ہوئے ہیں تو وہاں ایک اور موضوع اسی موضوع کی نسبت سے سامنے آتا ہے۔ وہ زمین سے وابستگی یا مٹی سے محبت کا موضوع ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہی یہ موضوع غزل میں موجود تھا لیکن ۷۰ کی دہائی میں یہ موضوع پوری شدت سے سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔ وطن سے محبت اور مٹی سے وابستگی ۷۰ کی دہائی میں شدت اختیار کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وطن کے لیے لاکھوں تکلیفوں کو گوارا کیا گیا وہ وطن اب پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے لیے موزوں نہیں رہا۔ رزق کی تلاش اور بہتر مستقبل کی خواہش نے ملک سے بیرون ملک جانے کی ضرورت پیدا کی ہے۔ جس سے مٹی کی محبت اور بے گھری کا دکھ اردو غزل میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

(افتخار عارف)

۷۰ کی دہائی تک آتے آتے اردو غزل اپنی کلاسیکی روایت سے بالکل مختلف انداز اختیار کر چکی تھی۔ اب غزل ذہنی الجھنوں اور حساس دلوں کے دکھ اور کرب کی تصویر بن گئی تھی اور بے یقینی، رائیگانی، خوف مرگ، عدم تحفظ، بے بسی، لاچاری کی منہ بولتی تصویر بن گئی۔ بقول سہیل احمد:

> ''نئی غزل کا مزاج بھی نیا ہے۔ وہ نظریات اور فارمولوں کی حدود سے نکل کر نئے زاویے تلاش کر رہی ہے۔ یہ زاویے معروضی حالات کے فرد پر اثرات سے رونما ہو رہے ہیں کیونکہ نئے انسان کے پاس کوئی نظریہ، مقصدِ حیات اور فارمولا نہیں رہ گیا۔ لہٰذا نئی غزل کو بھی کسی مخصوص نظریے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر سمجھا جا سکتا ہے تو محض نئی تہذیب اور نئے فرد کے توسط سے۔(۱۵)

۷۰ کی دہائی کے شعرا نے درپیش صورت حال کے خلاف اپنے اپنے طور پر ردعمل ظاہر کیا جس کا فائدہ اردو غزل کو نئے موضوعات کی صورت میں ہوا۔ شعرا کا یہ ردعمل جہاں ان کی انفرادیت اور پہچان بنا وہاں غزل کو نئے موضوعات دے گا۔ سب نے اپنے اپنے طور پر حالات کے خلاف ردعمل ظاہر کیا جس سے موضوعاتی تنوع پیدا ہوا اور غزل کا موضوعاتی دائرہ وسیع ہونے لگا۔

حوالہ جات

۱۔ نظیر صدیقی، ''جدید اردو غزل ایک مطالعہ''، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۴

۲۔ حنیف کیفی، ''غزل کا نیا رنگ و آہنگ چند پہلو'' مشمولہ ''معاصر اردو غزل''، مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، ص ۱۹۰

۳۔ نظیر صدیقی، ''اردو غزل کے جدید رجحانات'' مشمولہ ''مقالات کل پاکستان اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۱ء''، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۲۳۳

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات''، ص ۷۵

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''اردو شاعری آزادی کے بعد'' مشمولہ ''پاکستانی ادب'' پانچویں جلد (تنقید)، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، فاروق علی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۲ء، ص ۶۹۱

۶۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، ''تنقیدی مطالعے''، نذیر سنز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۵۲

۷۔ انیس اشفاق، ''بیسویں صدی میں اردو غزل'' مشمولہ ''بیسویں صدی میں اردو ادب''، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۷۷

۸۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، ''اردو غزل کے نئے زاویے'' مطبوعہ ''فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر، جلد ۸، شمارہ ۳، ۴، ۱۹۶۹ء، ص ۸۰

۹۔ مرزا حامد بیگ، ابتدائیہ ''دیوارِ آب'' از محمد اظہار الحق، ایس ٹی پرنٹرز، روالپنڈی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷

۱۰۔ خواجہ محمد زکریا، دیباچہ ''رچنا'' از علی اکبر عباس نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کلچرل سٹڈیز لوک ورثہ اسلام آباد، ص ۲۰

۱۱۔ جلیل عالی سے راقمہ کا انٹرویو، ۱۱ جولائی ۲۰۱۲ء، بمقام چکلالہ سکیم III، راولپنڈی

۱۲۔ افتخار عارف سے راقمہ کا انٹرویو، ۱۲ جولائی ۲۰۱۲ء، نمل، اسلام آباد

۱۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''دائرے اور لکیریں''، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۰

۱۴۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ''ایک موسم کے پرندے'' مطبوعہ ''ماہِ نو'' لاہور، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۹۲

۱۵۔ سہیل احمد، ''قدیم و جدید غزل اور ہمارے تہذیبی تغیرات'' مشمولہ ''بازیافت'' لاہور، شمارہ ۱۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۲